ISSN : 2455-0248

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب و ثقافت ⑩

مارچ 2020

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدر آباد

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب و ثقافت

10

مارچ 2020

مدیر

پروفیسر محمد ظفر الدین

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Directorate of Translation & Publications
Maulana Azad National Urdu University

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)
Issue: 10 March, 2020
ISSN : 2455-0248

ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا تحقیقی اور ریفریڈ جریدہ

ششماہی **ادب وثقافت** حیدرآباد

ناشر : ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد - 500032 (تلنگانہ)

طباعت : پرنٹ ٹائم اینڈ بزنس انٹر پرائزز، حیدباد

رابطہ : 09347690095

ای میل : *directordtp@manuu.edu.in*
zafaruddin65@gmail.com

سرپرست

ایڈیٹوریل بورڈ

فہرست

ADAB-O-SAQAFAT, A Research & Refereed Journal (ISSN-2455-0248) March 2020, P: 83-115
Prof. Arshad Masood Hashmi, Naseer Haussain Khayal: Sawanahi Kawaif
ارشد مسعود ہاشمی

نصیر حسین خیال: سوانحی کوائف

ہندوستان کے صوبۂ بہار کے صف اول کے سنجیدہ اور صاحب طرز نثر نگاروں میں سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سید امداد امام اثر، سید علی محمد شاد عظیم آبادی، عبدالغفور شہباز، نصیر حسین خیال، سید سلیمان ندوی اور حمید عظیم آبادی کے اسمائے گرامی ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی خدمات اردو نثر نگاری کی تاریخ کا زریں باب ہیں۔ ان ارباب فضل و کمال میں نصیر حسین خیال اپنی انشا پردازی کی وجہ سے ممتاز تصور کیے جاتے ہیں۔

سید نصیر حسین خان خیال (21 مارچ 1872ء - 11 دسمبر 1934ء) عظیم آباد کے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے دو صدیوں تک اردو پروری کی تھی۔ انھوں نے تادم عمر خاندان کی اس وراثت کی پاسداری کی۔ وہ زباندان تھے اور نثر نگاری کے شیدائی۔ ماموں سید الشعرا شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل ہونے کے باوجود انھوں نے اوائل عمری میں ہی درستگی زبان، نثر کی خدمت اور اردو کے حقوق کے حصول کے لیے شاعری ترک کردی۔

خیال کو اب تک ان کی صرف دو تصانیف ''داستان اردو'' اور ''مغل اور اردو'' کی روشنی میں دیکھا جاتا رہا ہے جبکہ ان کی نثری خدمات کا دائرہ وسیع ہے۔ ان کی تحریروں میں موضوعات اور اسالیب کا تنوع موجود ہے۔ وہ صاحب طرز انشا پرداز بھی تھے، قوموں کی ثقافتی تاریخ کے نبض شناس بھی؛ بالغ نظر مبصر ادب بھی تھے، مکتوب نگار اور انشائیہ نگار بھی۔ ان کی زندگی اور تحریروں کا صرف ایک نصب العین تھا۔ وہ اردو دانوں کو اس زبان کی عظمت و انفرادیت کا احساس عطا کرتے ہوئے اس سے وابستہ ان تمام ثقافتی اور اخلاقی قدروں کو زندہ و تابندہ دیکھنا چاہتے تھے جنھوں نے

اس کی تشکیل اور نشو و نما میں اپنے کردار ادا کیے ہیں۔ خیال محبّ وطن تھے، ہندو مسلم اتحاد کے حامی و پیامبر اور مشترکہ قومی کلچر کے ثنا خواں بھی۔ انھیں ہندوستانی رزمیوں سے وابستہ ادبی روایتیں اتنی ہی عزیز تھیں جتنی ''شاہنامہ'' اور مراثیٔ انیس کی روایتیں۔

خیال مشرق و مغرب کے کلاسیکی ادب اور اس کے ثقافتی پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں بیسویں صدی کے اوائل کی ان ملک گیر سرگرمیوں کے ایک کلیدی اور فعال رکن بھی تھے جن کا تعلق مسئلۂ زبان سے تھا۔ تاریخِ اقوام ان کا محبوب موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں مغربی مصنفین کی تحریروں سے انھوں نے جا بجا استفادہ بھی کیا ہے۔ وہ مشرقی ثقافت، بطور خاص ہندوستان کی قدیم ثقافت اور مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے ثنا خواں تھے تو دوسری جانب مغربی تعلیم کے حامی بھی تھے۔ اس حمایت کے باوجود نوآبادکاروں کی ان حکمت عملیوں کی سخت مخالفت بھی کرتے تھے جن سے مشرقی اقدار مجروح ہوتی تھیں۔ تعلیم کے ایسے نوآبادیاتی نظام کی انھوں نے حتی الوسع تکذیب کی اور اس نظام کے پس پردہ موجود استعماری قوتوں کی اصل منشا کو بھی گرفت تفہیم میں لینے کی سعی کی ہے۔

حسب و نسب

نصیر حسین خیال کا تعلق انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے اوائل کے عظیم آباد اور کلکتہ سے تھا۔ عظیم آباد میں ان کے خانوادے نے تقریباً دو سو برسوں تک اردو پروری کی تھی۔ اس کی رئیسانہ شان و شوکت اور علمی و ادبی سرگرمیوں کی بدولت؛ اس کی معاشرتی، تہذیبی اور ٹکسالی زبان کی وجہ سے یہ شہر دہلی کا نمونہ بن چکا تھا۔ خیال کے مورث اعلی عرب سے ایران آئے اور مغلوں کے زمانے میں انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پھر اس خانوادے کے افراد فرخ سیر اور محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں پانی پت اور دہلی سے عظیم آباد تشریف لائے۔ مغلوں کے عہد میں اس خاندان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ اس کے دو اصحاب، قطب الملک نواب سید عبداللہ خان اور امیر الامرا نواب سید حسین علی خان، بادشاہ گر کہلاتے تھے۔

سید حسین علی خان جب بہار کے صوبہ دار مقرر ہوئے تو ان کا مستقر عظیم آباد ہی تھا جہاں دہلی کے تخت شاہی کی جانب سے انھیں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ جب یہ حضرت فرخ سیر کو بادشاہ

بنا کر خود اس کے وزیر بن گئے تو یہ جا گیران کے چھوٹے بھائی نواب زین الدین علی خاں کو ملی، اور انھوں نے اس تقریب سے بہار میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔نواب زین الدین علی خاں خیال کے پردادا تھے(احسن 96)۔

خیال کے دادا نواب سید محسن خاں محسن کی والدہ سید تفضّل علی تفضّل، حاکم کٹرا مانک سے بیاہی تھیں۔ان کا سلسلۂ نسب محمد نور سے ملتا ہے جن کی اہلیہ خواجہ بہاء الدین نقشبند کی دختر تھیں۔محسن خاں کی والدہ، نواب بیگم، نواب میر سید زین الدین علی خاں کی پانچویں نسل سے ہیں۔میر سید تفضّل علی خیال کے پردادا تھے۔زین الدین علی خاں سے ان کا سلسلۂ پدری و مادری دونوں ملتا ہے۔میر تفضّل علی کے دو صاحبزادے تھے، سید محسن خاں محسن اور سید محمد عباس خاں عباس۔سید عباس شاد عظیم آبادی کے والد تھے۔ان کی دختر، یعنی شاد کی ہمشیرہ سید النسا بیگم، نواب محمد محسن کے دوسرے صاحبزادے سید نوروز حسین کی زوجہ اور خیال کی والدہ تھیں۔شاد، خیال کے حقیقی ماموں تھے۔خیال جب چار برس کے تھے تو والد کی رحلت ہوگئی اور ان کی پرورش و پرداخت دادی نواب فاطمہ بیگم کی نگہداشت میں ہوئی جو نواب محمد عیسیٰ خان کی صاحبزادی تھیں۔ان کا تعلق دلی اور پانی پت سے تھا۔ان کی نانی نواب عارفہ بیگم (بنت نواب مہدی علی خاں مہدی) بھی دہلی نژاد اور پانی پتی تھیں۔دادا نواب سید محمد محسن خان اور نانا سید محمد عباس بھی دہلوی تھے۔

یہ خاندان حسینی الحسنی سیدوں کا تھا اور ان کے رشتے سادات بارہہ سے بھی تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ، صوبہ دار بنگال و بہار، سے تعلقات اور برادری کی وجہ سے سادات بارہہ کے زوال کے بعد بھی اس خاندان کا دبدبہ قائم رہا۔اس خاندان کی ایک شاخ پانی پت میں رہ گئی تھی جس کے مورث اعلی شمس الدولہ نواب لطف اللہ خاں بہادر محمد شاہ کے وزیر تھے۔ یہ خاندان بھی اپنی علمیت اور فضیلت میں مشہور تھا۔خواجہ الطاف حسین حالی کا تعلق (احسن 97) اسی خاندان سے ہے۔

خیال کے سلسلۂ نسب میں ایک کا تعلق اس حسینی الحسینی خاندان سے ہے جس کے ہندوستان میں مقیم ہونے والے جد اعلا میں محمد نور پہلے بزرگ ہیں جن کی شادی حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بند کی دختر سے ہوئی تھی۔محمد نور کے صاحبزادے نواب سید دانشمند خان کے بیٹے میر

رستم علی دلی سے عظیم آباد آئے اور مغلیہ سرکار سے حاصل جاگیروں کی وجہ سے وہیں کے ہو رہے۔ ان کے نبیروں میں سید مردان علی، سید حیسر علی، سید قنبر علی، سید تفضّل علی (حکمران کٹرہ مانک پور)، سید محمد محسن اور سید محمد عباس شامل ہیں جنھوں نے عظیم آباد کو ہر لحاظ سے آباد رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ سید محمد عباس اور سید محمد محسن بالترتیب، خیال کے نانا اور دادا تھے۔ خان بہادر شاد عظیم آبادی سید محمد عباس کے صاحبزادہ تھے۔ دوسرا نسبی سلسلہ سادات بارہہ سے شروع ہوتا ہے۔ نواب سید زین الدین علی خان بہادر کے پوتے نواب میر سید صفدر علی خان بہادر کی دو صاحبزادیاں تھیں، نواب بیگم صاحبہ اور نواب الٰہی بیگم۔ اول الذکر میر سید تفضّل علی سے بیاہی تھیں۔ موخرالذکر کی شادی محمد عیسیٰ خان سے ہوئی، اور ان کی صاحبزادی نواب فاطمہ بیگم کے دو بیٹوں میں ایک (سید نوروز حسین) خیال کے والد تھے، اور دوسرے (سید جعفر حسین) خیال کے چچا، جن سے خیال کی والدہ کا دوسرا نکاح بھی ہوا۔ اس خاندان کا تیسرا سلسلۂ نسب نواب خواجہ عبدالرزاق خان بہادر سے شروع ہوتا ہے جو گورکھپور کے صوبہ دار تھے۔ ان کے فرزندوں میں شمس الدولہ نواب لطف اللہ خان صادق بہادر امرائے عالمگیر میں شامل ہونے کے ساتھ ہی شاہزادہ معظم کے اتالیق بھی تھے۔ ان کے پسر نواب عنایت خان راسخ بہادر یمین الدولہ ننیہالی رشتہ کے اعتبار سے خیال کے جد اعلا تھے۔ ان کے نبیروں میں نواب مہدی علی خان بہادر کی صاحبزادی نواب عارفہ بیگم خیال کی نانی تھیں۔ خیال کے حسب ونسب کا چوتھا سلسلہ شاہ عباس صفوی کے وزیر نواب زہر یار خان سے متعلق ہے جن کے صاحبزادہ نواب محمد ابراہیم خان کا نکاح حیدرآباد میں ابوالحسن تاناشاہ کی ہمشیرہ سے ہوا تھا۔ فتح گولکنڈہ کے بعد وہ دلی ہوتے ہوئے عظیم آباد تشریف لائے جہاں ان کے صاحبزادے نواب علی جواد خان بہادر کی شادی حاجی میرزا محمد (برادر نواب علی وردی خان مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ) کی دختر سے ہوئی۔ ان کے صاحبزادہ نواب اسمعیل قلی خان بہادر مونگیر کے صوبہ دار تھے۔ ان کی اولادوں میں نواب احمد حسین خان بہادر فوج بنگالہ کے کمانڈر تھے اور اِن کے بیٹے نواب محمد ابراہیم خان خیال کی نانی نواب عارفہ بیگم کی ماں نواب نورالنسا کے والد تھے۔

رسالہ 'جادو'، ڈھاکہ (جنوری فروری 1926ء۔ ص 25-20) میں نصیر حسین خیال نے خودنوشت 'تزک خیال' میں متذکرہ چار شجرے درج کیے ہیں۔ خیال کے پدری اور مادری سلسلۂ

نسب میں صاحب ثروت اور ذی علم واہل قلم حضرات کی قابل لحاظ تعداد ہے۔ان کا ذکر ''تذکرۂ شورش'' اور ''تذکرۂ عشقی'' میں بھی موجود ہے۔اس خاندان کے دو قطب، شاد و خیال، اپنے کارناموں کے سبب بہار کے انیس و آزاد کہلائے۔'شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری' میں وہاب اشرفی نے لکھا ہے کہ

> شاد کا زمانہ جہاں بہار میں اردو شاعری کے عروج کا زمانہ ہے، وہاں یہ عہد نثر کی ترقی کے لیے بھی ممتاز ہے۔شاد کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں کا ایک کارواں تھا جن کی تصنیفات نے اردو نثر کی توسیع و اشاعت میں بڑا کام انجام دیا ہے۔اردو ادب کی تاریخ میں میر فرزند علی صفیر بلگرامی، شوق نیموی، امداد امام اثر، مولوی عبدالغفور شہباز، فضل حق آزاد، عبدالغنی استھانوی، نصیر حسین خیال، شاہ محمد اکبر داناپوری وغیرہ کے نام نا قابل فراموش ہیں۔ان میں اکثر کی تصنیفات ہندوستان گیر شہرت رکھتی ہیں، اور اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے منبع فیض ہیں (57)۔

ولادت

سید نصیر حسین کی پیدائش شہر عظیم آباد (پٹنہ) کے محلّہ حاجی گنج کی چھوٹی حویلی میں 21 مارچ 1872ء کو ہوئی تھی۔سید رضا قاسم کے مطابق ان کی تاریخ ولادت 21 مارچ 1860ء ہے (ندیم)۔شائق احمد عثمانی نے بھی یہی تاریخ پیدائش لکھی ہے (مغل اور اردو 1)۔سید بدرالدین احمد (496) اور محمد اقبال سلیم (داستان اردو 2) نے سال پیدائش 1878ء لکھا ہے۔خود خیال نے بھی اپنا سال ولادت 1878ء ہی بتایا ہے۔وہ لکھتے ہیں، ''میں پٹنہ عظیم آباد کے ایک قدیم، مشہور اور خوشحال خاندان میں 21 مارچ 1878ء کو بروز نوروز پیدا ہوا'' (تزک، جنوری فروری، 1)۔ نقی احمد ارشاد نے سنہ پیدائش کے ضمن میں جو توضیحات پیش کی ہیں (نصیر حسین خیال 2-1) ان کی رو سے اول الذکر سنہ درست ہے۔خیال نے لکھا ہے کہ ان کی پیدائش کے تین برسوں کے بعد والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ان کی وفات کا سنہ 1876ء ہے۔اس لحاظ سے خیال کا سال پیدائش 1860ء یا 1878ء نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

خیال کے مضامین اور ان سے متعلق تحریروں میں ان کا مکمل نام ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں خیال ملتا ہے۔ادیب الملک قدر دانوں کا عطا کیا ہوا خطاب تھا۔خاندان کے کئی بزرگ خان بہادر کے لقب سے سرفراز ہوئے تھے، بایں لحاظ وہ بھی اپنے نام میں خان لکھا کرتے تھے۔رئیسانہ شان وشوکت کے مالک تھے مگر ابتلائے زمانہ کی وجہ سے خود صاحب ثروت نہ تھے کہ آمدنی کا مستقل ذریعہ نہ تھا۔چونکہ خاندان میں کئی نوابین رہے تھے اس نسبت سے اپنے نام کے ساتھ نواب بھی لکھتے تھے۔حالانکہ خود نواب نہ تھے۔

والد کی رحلت اور والدہ کا عقد ثانی

خیال کے والد سید نوروز حسین شاد عظیم آبادی کے حقیقی چچازاد بھائی تھے اور ان کی زوجہ شاد کی چھوٹی بہن تھیں۔ان سے دو اولادیں ہوئیں: خیال اور ان سے چھوٹی بہن، سجادی بیگم۔ سجادی بیگم شمالی بہار کے شہر مظفر پور کے نواب محمد تقی خاں کے خلف سید محمد نواب یاس کی زوجہ تھیں۔ سید نوروز حسین کی رحلت کے بعد خیال کی والدہ کا عقد ثانی سید نوروز حسین کے بڑے بھائی سید جعفر حسین سے ہوا جن سے انھیں تین اولادیں ہوئیں۔

پرورش و پرداخت

والد کی رحلت کے تین برسوں کے بعد جب دادی کی وفات بھی ہوگئی تو ان کی پرورش اور تربیت سید جعفر حسین اور شاد نے کی۔شاد اور خیال کے زمانے تک دولت کی فراوانی ختم ہوچکی تھی۔خاندانی وقار اور علم کی شہرت باقی تھی۔شاد کو پدری اور مادری ترکے سے ماہانہ تقریباً پچاس روپے ملتے تھے۔شاد کی بہ نسبت خیال کی مالی حالت قدرے بہتر تھی۔لطف اللہ خاں صادق کی وفات کے بعد حسب قانون مغلیہ ان کی جائداد کی ضبطی کے عوض جو رقم ملی اسے لے کر شاکر خاں عظیم باد آئے اور دو چار مواضعات حاصل کیے۔ان کے گذر جانے کے بعد خیال کی دادی فاطمہ بیگم کو موضع پہلاد پور، پرگنہ غیاث پور ملا جس کا کچھ ٹکڑا خیال کے حصے میں آیا (ارشاد 14)۔

مذہبی عقیدہ

خیال حسینی الحسنی سید تھے۔ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اور عقائد و رسوم کا پابند بھی۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ان کا گھر عظیم آباد میں ادب وتہذیب کا مدرسہ سمجھا جاتا

تھا ('تزک خیال، جنوری۔فروری 9) جو مولویانہ یا صوفیانہ نہ ہونے کے باوجود مذہب اور اس کے ارکان و مراسم پہ سختی سے کاربند تھا۔

> محرم کے مراسم و مجالس میں، اپنے گھر میں، بہت کم افراط و تفریط میں نے دیکھی۔ ہاں، اخیر زمانہ میں عشرہ کی ایک تاریخ میں زنجیر کا ماتم ہونے لگا تھا۔ مگر ہمارے بزرگ اس بدعت سے خوش نہ تھے۔ ہمارے یہاں کی مجلسوں میں مسلمانوں کا ہر فرقہ بہ شوق شریک ہوتا اور کسی کو بھی کسی اعتراض کا موقعہ نہیں ملتا تھا ('تزک خیال، جنوری۔فروری 12)۔

عظیم آباد کے زیادہ تر شرفا کے گھرانوں کا یہ حال تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان زمانوں میں وہاں مذہبی تفرقہ کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا ہے۔

شادی اور کلکتہ میں سکونت

1899ء میں نواب واجد علی شاہ کے وزیر انتظام الدولہ احمد بیگ کی دختر سے خیال رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ بدرالدین احمد (498) اور اقبال سلیم (1) نے یہی سال لکھا ہے جبکہ ارشاد نے لکھا ہے (13) کہ ان کی شادی کلکتے میں 1896ء میں ہوئی۔ پھر انھوں نے 1900ء میں، اور بعض روایتوں میں 1899ء میں عظیم آباد کو خیرباد کہہ کر کلکتے میں سکونت اختیار کر لی۔ شادی کے بعد ان کے اقتصادی حالات کچھ سنبھلے لیکن یہ تبدیلی دیرپا نہ تھی۔خیال کی بیگم کو ترکۂ پدری میں خاصی دولت ملی تھی مگر انھوں نے رئیسانہ طرز زندگی کی وجہ سے تمام دولت یوں خرچ کی کہ ان کے وفات کے وقت ڈھائی سو روپے نقد اور تین سوٹ کیس کپڑوں کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ ان کے صاحبزادے امیر نواب کو پچاس روپیہ ماہانہ تعلیمی وظیفہ (حیدرآباد سے) ملا کرتا تھا جو ان کی رحلت کے بعد بند کر دیا گیا۔ یہ حضرت تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، اور اب یہاں اس خاندان کا نام لیوا کوئی نہیں۔

انیسویں صدی کے اواخر تک سیاسی، معاشی یا معاشرتی اسباب سے دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد اور دیگر مراکز اردو سے ہجرت کے بعد کلکتہ کو اپنا مستقر بنانے والے ادیبوں اور شاعروں کی ایک وسیع تعداد ہے جن میں ایسے اصحاب قلم بھی شامل ہیں جن کے ذاتی اور تخلیقی جوہر یہاں کے

زمانہ شناس اور عہد ساز ادبی ماحول میں ایسے درخشاں ہوئے کہ متعلقہ عہد کے دیگر ادبی مراکز کی تابانیوں کو ماند کرنے لگے۔نصیر حسین خیال نے عمر عزیز کے کم وبیش چونتیس برس یہاں گذارے اور یہیں سے انھیں ملک گیر سطح پر جادو بیان مقرر اور صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے شناخت بھی حاصل ہوئی۔

کلکتے میں ان دنوں مسلم انسٹی ٹیوٹ، زکریا اسٹریٹ کا رنگون ریستوراں، خیال کی بنیا پوکھر اور گارڈن ریچ کی کوٹھیاں اور تال تلہ کے پاس شاد عظیم آبادی کا دولت خانہ ایسے مراکز تھے جہاں فارسی اور اردو شعر وادب کے اکابر واساطین کی مجلسیں سجتی تھیں۔مظفر الحسن شمیم،سلیم اللہ فہمی، مولوی چراغ حسن حسرت، پروفیسر عبدالرحیم، پروفیسر محفوظ الحق، نجیب اشرف ندوی، مولانا جلال الدین تہرانی، بہادر رضا علی وحشت کلکتوی، مولانا شائق احمد عثمانی، نواب زادہ ایف ایم عبدالعلی، باقی غازی پوری وغیرہ ان صحبتوں میں شامل رہنے والے نامور حضرات تھے۔

1909ء میں انھیں ایم اے او کالج، علی گڑھ کے ٹرسٹی کی ذمہ داریاں عطا کی گئیں اور 1912ء سے 1919ء تک ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے رکن بھی رہے۔

تلاش معاش وسیر وسیاحت

خیال ابتداءً بڑی حد تک فارغ البال تھے لیکن خاندانی دولت وثروت دستورِ امرا و نوابین نبھانے میں صرف ہوگئی۔شادی کے بعد مالی حالات قدرے بہتر ہوئے تاہم بود وباش اور مجلسی زندگی کا انداز وہی رہا جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ ذرائع آمدنی کی جستجو کی جانب مائل ہونے لگے۔طرحدار تو تھے ہی، مزاج میں رعونت بھی تھی، خاندان کی وجاہت ونیک نامی کا اثر بھی تھا کہ دست طلب دراز نہیں کر پاتے تھے۔حالات نے کسی حد تک مجبور کر دیا تو اپنے مراسم کی بنا پر ایسے مواقع تلاشنے لگے جن میں عزت ووقار بھی ہو۔معاش کے سلسلے میں چند برسوں تک حیدرآباد میں مقیم رہے جہاں انھوں نے سر علی امام کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔نظام حیدرآباد اور مہاراجہ سر کشن پرشاد سے ان کے دیرینہ تعلقات رہے۔لیکن پریشاں حالی ان کا مقدر بنی رہی۔ مسلم عظیم آبادی کے نام لکھے خیال کے ایک خط سے یہ واقفیت ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں اپنے قیام سے وہ خوش نہیں تھے۔مہاراجہ سر کشن پرساد شاد کے ایک خط سے بھی یہ علم ہوتا ہے کہ خیال کسی

معاملے میں حیدرآباد سے بدظن ہو گئے تھے۔ان کے درمیان خط وکتابت کا ذکر کرتے ہوئے حبیب ضیا نے لکھا ہے کہ دونوں کے آپس میں گہرے مراسم تھے اور ان کے درمیان عرصہ تک مراسلت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔انھوں نے مہاراجہ کو لکھے خیال کا ایک خط، بتاریخ 22 جولائی 1925ء،بھی شائع کیا ہے(241)۔

مائی ڈیرسر یمین السلطنت بہادر

عرض بندگی چاکرانہ

ایک عرصہ دراز سے خیر وعافیت مزاج مبارک و عالی معلوم نہیں۔امیدوار ہوں کہ از راہ شفقت بزرگانہ دوکلمۂ خیریت ارشاد فرما کر سرفراز وممتاز کیا جاؤں۔زیارت قدم بوسی کے اشتیاق کو کیا عرض کروں۔اس اثنا میں اکثر شرف ملاقات و نیاز کا قصد ہوا کہ ایک مرتبہ پھر حیدرآباد حاضر ہوکر مشرف ہوں مگر شومیٔ قسمت سے قاصر رہا اور اب تک قاصر ہوں۔ دیکھیے ایسا مبارک موقع پھر کب نصیب ہوتا ہے اور جناب عالی فقیر کے دیرینہ اشتیاق کو پورا فرماتے ہیں۔

حبیب ضیا کا خیال ہے کہ اس خط (حبیب ضیا کی کتاب کی اشاعت سے قبل یہ خط ''نقوش'' کے مکاتیب نمبر میں شائع ہو چکا تھا) کے جواب میں لکھا ہوا مہاراجہ کا خط بھی کافی اہم ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی خیال کے حالات جاننے کے لیے مضطرب تھے۔مہاراجہ کا خط قارئین کی نذر ہے۔

مائی ڈیر حضرت خیال سلمہ اللہ تعالی

بعد نیاز دلی فقیر شاد اس یادفرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہے۔آپ کی بے خیالی کا اثر کچھ ایسا عالمگیر ہوگیا ہے کہ اکثر احباب کے خیال سے شاد فراموش ہو چکا ہے یا لائق یاد فرمانے کے نہیں رہا۔فقیر اگر جناب کو لکھتا تو کس ایڈریس پر۔اس لیے کہ جب بھی دریافت کیا کہ حضرت خیال سلم کہاں تشریف فرما ہیں تو جتنی زبانیں اتنی ہی چیزیں۔کوئی مشرق،کوئی مغرب،

کوئی شمال، کوئی جنوب۔ الغرض یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ زمین کے ساتھ گرم سفر ہیں یا آپ کے بلاگردوں ہے۔ بہرحال آپ کی جانب سے کوئی بھی دو حرفی خط موصول ہونے پر بھی فقیر جواب سے تساہل کرتا تو ٹھیک مجرم تھا۔ اور یوں تو دلی دوستوں سے اس قدر غافل رہنے کو بھی فقیر جرم سمجھتا ہے، جس کا یہ فقیر مرتکب ہے۔ اور معافی کا خواستگار۔

کیا حیدرآباد سے آپ اس قدر ناراض ہو گئے کہ جس تاریخ سے روانہ ہوئے ہیں بھولے سے بھی کبھی آپ نے اس طرف کا قصد نہیں کیا۔

فقیر شاد مع فیملی کے خیریت سے ہے۔ لیکن آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ فقیر زادہ خواجہ پرشاد سلمہ اللہ تعالی کی بائیں آنکھ آہنی کیلے کے صدمے سے ایسی مجروح ہوئی کہ بینائی میں اس آنکھ کی فرق آ گیا۔ اس بدنصیبی کو کیا کہوں کہ کئی اولاد ذکور میں وارث جائز اور چراغ خاندان خدا رکھے رہ گیا تھا، اس میں بھی یہ نقص پیدا ہو گیا...... دعا فرمایئے کہ خدائے تعالی فضل فرمائے۔ باقی اور کیا لکھوں......حیدرآباد کب تشریف لائیں گے؟ اور ضرور تشریف لایئے (ضیا243-241)۔

خیال اس سے قبل اپنے مکتوب بتاریخ 10 فروری، 1920 میں بھی مہاراجہ سے اپنی پریشانیوں کا ذکر کر چکے تھے۔

کل فقیر کو جناب والا کے مزاج کے دوراز حال نا درست ہونے کی خبر معلوم ہوئی۔ شافیٔ حقیقی جلد صحت عطا فرمائے۔ میں تو اس درجہ مجوب ہوں کہ کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ مگر مجبوری و معذوریٔ فقیر پر خود جناب والا کی نظر ہوگی اور عدم حاضری پر امید ہے کہ میں خطاوار نہ سمجھا جاؤں گا (نقوش، مکاتیب نمبر۔477)۔

یہ خط سیف آباد، حیدرآباد سے لکھا گیا تھا۔ اس خط سے قبل 20 جنوری 1920ء کو وہیں سے مسلم عظیم آبادی کے نام خط میں خیال لکھتے ہیں کہ:

میں 23 اکتوبر سن گذشتہ کو یہاں پہنچا اور معاملات کچھ ایسے الجھے ہوئے
تھے کہ رخت سفر اتارنے کے قبل میرا کام شروع ہو گیا اور جب سے جُتا ہوا
ہوں۔ اب تک مجھے اپنی صحیح جگہ معلوم نہیں اور جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو
جائے میرا جی لگ نہیں سکتا (نقوش، مکاتیب نمبر، 475)۔

نواب سید سر علی امام موئد الملک بہادر، صدر اعظم، سرکار آصفیہ، سے خیال اور شاد کے گھریلو مراسم تھے۔ 1914ء میں حکومت ہند کے 20 اگست 1919ء کو سر علی امام مدار المہام کی حیثیت سے حیدر آباد تشریف لے گئے تھے (مانک راؤ وٹھل راؤ 1341ھ، 22)۔ خیال کو انھوں نے اپنے ساتھ صیغۂ اردو کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے رکھا تھا۔ لیکن حیدر آباد کے معاملات اندرونی سازشوں کی وجہ سے بگڑنے لگے تھے (سکسینہ 1991) جس کے شکار خود سر علی امام کے ساتھ ہی خیال بھی ہوئے۔ یہ حالات خیال کو راس نہیں آئے۔ اس سلسلے میں ارشاد نے لکھا ہے (19) کہ حیدر آباد کا جو تصور خیال کے ذہن میں تھا، انھوں نے وہاں کی تہذیب اس کے برعکس پائی۔ سازش، ریشہ دوانی، درباری مصاحبت، وغیرہ۔ یہ سب وہ معاملات تھے جو خیال کے مزاج کے مخالف تھے۔ سکسینہ نے اسے سیاسی رقابتوں کا دور کہا ہے۔ انہیں جو ذمہ داریاں دی گئیں، وہ غالباً ان سے خوش یا مطمئن نہیں تھے یا پھر وہ معاملات ان کے بس کے ہی نہ تھے۔ اسی خط میں وہ پھر لکھتے ہیں کہ دعا کیجیے کہ یا تو مجھے یہاں جلد اپنی صحیح جگہ مل جائے کہ میں مطمئن ہو کر کچھ کام [ادبی] کر سکوں یا یہاں سے گلو خلاصی ہی ہو جائے کہ عافیت کی زندگی نصیب ہو۔ سر علی امام کے مستعفی ہونے کے بعد خیال نے بھی حیدر آباد چھوڑ دیا۔ خیال کو لکھے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے ایک خط مورخہ 10 مئی، 1920ء (نقوش، مکاتیب نمبر۔ 372) سے واقفیت ہوتی ہے کہ خیال نے 11 مئی 1920ء کو حیدر آباد کو خیر باد کہا تھا۔

شاد نواز حضرت خیال دام محبتہ
۔۔۔ ابھی معلوم ہوا کہ کل آپ کا قصد روانگی کا ہے۔۔۔
آپ کا سچا خلوص اور آپ کی ہمدردی اہل دکن کے ساتھ اور خصوصاً آپ کا
حسن سلوک اس فقیر حقیر کے ساتھ، یہ صفات ایسے نہیں کہ شاد آپ کو دل

سے بھول جائے۔ اگر خدا نہ کرے ایسا کیا تو شاد بھی جماد بے حس ہے۔
چوں کہ آپ کا قصد سفر دور دراز کا ہے اس لیے شاد اپنے خاندان کے عمل
درآمد کے لحاظ سے حضرت امام ضامن علیہ السلام کے ضامن بھیج کر متوقع
ہے کہ آپ اس کو قبول کر کے شاد کو ممنون کریں۔

سازشوں کی آماجگاہ ہونے کے باوجود اس دور کا حیدرآباد علما اور دانشوروں کا مسکن بھی تھا۔اس کی وجہ سے سیاسی رقابتوں کے ساتھ ہی علمی رقابتیں بھی نمایاں ہونے لگی تھیں۔سر اکبر حیدری جیسے کچھ حضرات ایسے بھی تھے جو غیر دکنی اصحاب کے برسرعہدہ ہونے کی مخالفت پہ کمر بستہ تھے۔ ان کے مقامی ہونے کی وجہ سے سرکار میں ان کے رسوخ بھی زیادہ تھے۔ ان کی رخنہ اندازیوں کے سبب سر علی امام یا سر سید راس مسعود جیسے اکابرین آزادانہ طور پہ اپنے فرائض ادا کرنے میں مشکلات کا سامنا کرتے رہے۔ وہیں دوسری جانب اپنی علمی یا ادبی حیثیت کا احساس عطا کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح نظام سے داد و دہش کے طالبوں کی کمی بھی نہ تھی۔

خیال حیدرآباد سے واپس کلکتہ آگئے تھے۔کبھی کبھی پٹنہ میں بھی قیام رہتا تھا جہاں وہ عموماً شاد عظیم آبادی کے دولت کدہ پر ہی رہا کرتے تھے۔لیکن حیدرآباد میں ان کے قیام کے دوران خود شاد کو بھی ان سے بعض توقعات وابستہ ہوگئی تھیں جن کا ذکر شاد نے اپنے غمگسار و مددگار دوست سید ہمایوں مرزا کے نام لکھے اپنے مکاتیب میں کیا ہے۔ان مکاتیب (مکتوبات شاد عظیم آبادی، 1939ء) سے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

نصیر میاں کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بہت کم ہے۔ غالباً اگر
میں حیدرآباد پہونچوں بھی تو مجھ سے ملاقات نہ کریں گے اور وہاں فرد ہونا
تو ناممکن ہے۔ یہاں مشہور کر رکھا تھا کہ خاص سرکار نظام کے سکریٹری اور
پچیس سو روپیہ ماہانہ تنخواہ ہے۔ سر سید علی امام صاحب سے اس دفعہ پوچھا
تو انھوں نے اردو صیغہ کا ان کو اپنا سکریٹری بتایا (84-83)۔
مجھے کمال حیرت تھی جب سے نصیر میاں سلمہ ہمارے صدر اعظم طال بقا
کے پرائیوٹ سکریٹری ہوئے ہیں، برخلاف گذشتہ میرے خطوں کے

جواب کیوں نہیں آتے۔ نصیر سلمہ پر حیرت نہ تھی بلکہ اس پر حیرت تھی کہ سر سید علی امام صاحب نے کیوں ادھر توجہ نہ کی (88-87)۔

میں نے نور چشم نصیر میاں سلمہ کا کیا بگاڑا ہے، اگر نقصان کیا یا کر رہا ہوں تو اپنا کیا۔ پہلے تو خواجہ صاحب وکیل اور مسٹر سلطان احمد صاحب کو لکھ لکھ بھیجتے تھے کہ ستر برس کی عمر میں اس بڑھے کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی باتوں کا اعتبار کر رہا ہے۔ اب سلطان نہیں ہیں تو محلّہ کے لوگوں کو میری نسبت مضحکہ آمیز وطنز و تشنیع لکھا کرتے ہیں (115)۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ شاد، بوجوہ، خیال سے بدظن ہو گئے تھے۔ محولہ بالا اقتباسات بالترتیب فروری 1920، 6 اپریل 1920ء اور 2 ستمبر 1922ء کے مکتوبات سے ہیں۔ 2 ستمبر 1922ء کے ہی مکتوب میں یہ بھی رقم ہے کہ ''میاں نصیر نے لوگوں کو لکھا ہے کہ حیدرآباد میں بجز کشن پرشاد کے علی محمد شاد کے اعلی مضامین کو سمجھتا کون ہے۔ نتیجہ یہ کہ اگر کسی اور ذریعہ سے دکن گئے بھی تو ان کا کمال مٹی میں مل جائے گا۔۔۔ میاں نصیر نے لوگوں کو لکھا ہے کہ صدر اعظم کو دو سو روپیہ ماہانہ منصب دینے کا اختیار ہے (117)''۔ پھر 21 ستمبر 1922ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ''مکرر یہ کہ سر علی امام صاحب کو تا امکان ٹٹو لیے کہ وہ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں (129)''۔ ان مکتوبات سے واضح ہے کہ خود شاد عظیم آبادی اپنی مالی مشکلات رفع کرنے کے لیے سر علی امام سے امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ ابتداءً سر علی امام نے کچھ وعدے کیے لیکن انھیں ایفا نہ کر پائے۔ خیال سے بھی انھیں توقع تھی کہ حیدرآباد میں ان کے لیے مالی منفعت کی کوئی صورت نکالنے میں وہ معاون ثابت ہوں۔ لیکن وہاں کی زمینی سچائیاں کچھ اور تھیں۔ گرچہ سید ہمایوں مرزا حسب استطاعت کبھی کبھی ان کا تعاون کر دیا کرتے تھے، بعد ازاں وہ بھی شاد کے ان خطوط کا جواب موخر کرنے لگے جن میں فرمائشیں ہوتی تھیں۔ ان مکاتیب سے ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سر علی امام سے انھیں جو امیدیں وابستہ تھیں وہ بھی رفتہ رفتہ دم توڑتی گئیں۔ ایک خط میں (مورخہ 24 فروری 1925ء) میں کہتے ہیں کہ ''واقعی میری عقل حیران ہے کہ آخر مجھ غریب نے حضرت سر سید علی امام صاحب کا کیا بگاڑا تھا کہ حیدرآباد کے بارہ میں مجھ کو اس قدر دھوکے میں رکھ کر سخت زیر بار

کر دیا(223)''۔ان مکاتیب میں ہی انھوں نے بار بار یہ بھی لکھا ہے کہ نصیر میاں [خیال] پٹنہ میں ہیں اور ان کے ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔ شاد اور حیدر آباد کے تعلقات (سید سر علی امام اور مہاراجہ کشن پرشاد سے سید ہمایوں مرزا اور سید سر راس مسعود تک) اگلے زمانوں میں بھی موضوع گفتگو رہے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے بھی اس سلسلے میں خوب لکھا تھا (بعض تفصیلات 'معیار' کے قاضی عبدالودود نمبر میں بھی موجود ہیں)۔ تاہم، ان تفاصیل سے مترشح ہے کہ حیدر آباد میں خیال کا قیام، ان کے تمام تر تعلقات و وابستگیوں کے باوجود، اس نہج کا نہیں تھا کہ وہ کسی اور کے لیے تو کیا، خود اپنے لیے بھی کچھ کر سکتے۔ لیکن اس کا یہ نقصان ہوا کہ ان کے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا ہونے لگیں یا کی جانے لگیں۔ بعد ازاں شاد عظیم آبادی کو بھی یہ احساس ہو گیا تھا۔

حیدر آباد سے لوٹنے کے بعد خیال کلکتہ، پٹنہ، اور دارجلنگ آتے جاتے رہے۔ کہیں مستقل قیام نہیں رہا۔ انھیں آمدنی کی فکر ستانے لگی تھی۔ کلکتہ میں اہلیہ کی علالت کی وجہ سے خیال کو یورپ کا سفر ملتوی کرنا پڑا تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو 8 اگست 1920ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ۔

> ۔۔۔فقیر حد درجہ خجل و شرمسار ہے کہ خدمت عالی میں اب تک عریضہ نگار ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ کلکتہ آ کر جناب عالی کی خادمہ سخت علیل ہوئیں اور ڈیڑھ ماہ تک صاحب فراش رہیں۔ خیر، اب وہ اچھی ہیں۔ ان کی علالت کی وجہ سے سفر یورپ بھی ملتوی ہو گیا تھا مگر اب کہ الحمدللہ اطمینان ہے، 21 اگست کو ان شاءاللہ بمبئی سے اس سفر کا قصد ہے(476)۔

غالباً خیال نے مہاراجہ سے یورپ میں مستقل سکونت کا ارادہ بھی ظاہر کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ خیال پھر کسی صورت حیدر آباد میں ہی مقیم ہو جائیں لیکن وہاں کے حالات بھی موافق نہیں تھے۔ خیال کے محولہ بالا مکتوب کے جواب میں 13 اگست 1920ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ

> ۔۔۔سفر یورپ کے التوا کی خبر نے شاد کے حال کو خوش تو کیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی پھر آپ کا قصد بدستور معلوم کر کے افسوس ہوتا ہے۔ اگر چہ

> اب بھی دور ہیں لیکن ہندوستان میں رہ کر جب چاہیں حیدر آباد آسکتے ہیں۔ البتہ یورپ سے حیدر آباد آنا معنی دارد۔ اگر مستقل ارادہ ہے تو بسلامت روی و باز آئی۔ آپ کے حیدر آباد سے رخصت ہونے کے بعد بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ بلکہ اب تک جتنی زبانیں ہیں اتنی ہی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں (373)۔

انھوں نے نظام حیدر آباد کی عنایتوں سے 1920ء میں یورپ کا سفر کیا۔ فرانس، بلجیم، جرمنی، انگولہ اور اٹلی کی سیر سے لوٹنے کے دوران ترکی اور مصر کی سیاحت بھی کی۔ انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی، مصر، ترکی اور عراق میں ان کی کافی پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے ایک سفر نامہ بھی لکھا تھا لیکن ان کی نثر نگاری پر لکھی تحریروں میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ وہ 1922ء میں کلکتہ واپس آئے۔ اسی برس اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے کا اثر اتنا شدید تھا کہ علیل رہنے لگے۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے 1929ء میں خیر پور (سندھ) تشریف لے گئے تو ریاست خیر پور سے بھی وابستہ رہے۔ لیکن علاقائی، سیاسی مسائل اور وہاں کی ابتر صورت حال میں الجھ کر رہ جانا انھیں گوارہ نہ ہوا۔ نقی احمد ارشاد نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ خیر پور میں قیام کے دوران خیال کے صاحبزادے امیر نواب بھی ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ امیر نواب نے خیر پور کے میر صاحب کا بیان کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ

> میر صاحب نہایت بھاری بھرکم دراز قد تھے۔ پیٹ اتنا بڑا کہ ڈائننگ چیئر پر بیٹھ کر نہیں کھا سکتے تھے۔ ایک بڑی آرام کرسے پر پڑے رہتے تھے۔ دونوں بغل میں میزوں پر کھانے کی پلیٹیں رکھ دی جاتی تھیں۔ میر صاحب کے شکم پر بڑے تولیے بچھا دیے جاتے تھے۔ کبھی داہنی طرف ہاتھ مارا اور بھر مٹھی لقمہ منھ میں، اور کبھی بائیں طرف۔ یہاں تک کہ موٹے موٹے تولیے شوربے سے بھر جاتے تھے۔
>
> شیریں [میر صاحب کی محبوبہ] ملکۂ عالیہ بنی ہوئی تھی اور بڑے بڑے حکام کو تم، تیں کر کے مخاطب کرتی تھی۔ جب خیال مرحوم حیدر آباد میں نہ

ٹک سکے تو ایسی وحشی جگہ میں کب تک رہ سکتے تھے (20 ,1986)۔

بالآخر وہ سال بھر میں ہی استعفی دے کر پٹنہ لوٹ آئے۔ اب ان کی طبیعت بھی ناساز رہا کرتی تھی۔ ارشاد نے لکھا ہے کہ پیچش اور بواسیر کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پروفیسر اشہر لکھنوی کو خیال ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ

> (کلکتہ، 28 مارچ، 198)۔۔۔ میری حالت میں تبدیلی آج کل قابل اطمینان نہیں۔ آج دس دنوں سے دوا ترک کر دی۔ اور اپنے خدا کے سوا کسی کا زیر علاج نہیں۔ کب تک یہ حالت رہے گی اور اسے برداشت کر سکوں گا، نہیں جانتا (346)۔

یہ مرض پھر تا عمر رہا۔ اس درمیان طبیعت کچھ بحال ہوئی تو وہ عراق اور کربلا کی زیارت کے بعد لکھنؤ، علی گڑھ، دہلی اور لاہور کے سفر پہ بھی رہے۔ 1930ء میں ہی ایران بھی تشریف لے گئے جہاں شہنشاہ مملکت کے مہمان بنے۔ 1931ء میں وطن عزیز کو واپسی ہوئی تو کشمیر اور علی گڑھ میں ہی زیادہ قیام رہا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ان کی یہ کوشش رہی کہ سید سر راس مسعود سے حیدرآباد اور پٹنہ کے تعلقات کی بنا پر کسی طرح مالی استحکام کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی قابلیت اور اپنے ذاتی روابط کے حوالے بھی پیش کیے، لیکن نامراد رہے۔

یہ روایتیں بھی ملتی ہیں کہ سر راس مسعود جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو خیال کو شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے تقرر کرنا چاہتے تھے۔ خیال کے حیدرآباد میں قیام کے دوران ہی سر سید راس مسعود (نواب مسعود جنگ بہادر) سرکار آصفیہ میں ناظم تعلیمات تھے۔ جلیل قدوائی (1990) نے اس روایت کو سختی کے ساتھ مسترد کیا ہے۔ لیکن یہ بہرحال حقیقت ہے کہ اہلیہ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ خیال کی مالی آسودگی ختم ہوتی گئی اور وہ اس جستجو میں رہنے لگے کہ انھیں ان کے ادبی کاموں کی تکمیل کے بہانے سے ہی سہی، مالی تعاون میسر ہو جائے۔ اور اسی غرض کی تکمیل کے لیے ان میں خودستائی کی کیفیت در آئی تھی۔ اس سلسلے میں سید سر راس مسعود کو لکھے ان کے مکاتیب (1982) سے نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ علی گڑھ میں اپنی تقرری کے خواہاں

ہی نہیں تھے، بلکہ اسے اپنا حق بھی سمجھتے تھے۔ان مکاتیب میں،ہی خیال نے علمی کاموں کے بہانے دست طلب دراز کیا ہے۔

(پٹنہ سٹی۔26 اگست 1930)....اب بہت جلد جس طرح ہو فیصلہ کیجیے اور مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔یہ مدد بھی صرف ایک سال کے لیے چاہتا ہوں جس کے بعد پھر کسی امداد کی ضرورت نہیں رہے گی اور اپنی بقیہ زندگی آپ کی اور یونیورسٹی کی خدمت میں گذار دوں گا۔

مجھے اس وقت ساڑھے تین سو ماہوار ایک سال کے لیے اس غرض سے درکار ہیں کہ ایک دو پڑھے لکھے آدمیوں کو رکھ کر اس کتاب [داستان اردو] کو ختم کر دے سکوں.....جس طرح ہو مجھے اگست کے اخیر یا زیادہ سے زیادہ ستمبر کے پہلے ہفتے تک ضرور بالضرور وہاں آپ کے پاس آجانا اور آپ کی یونیورسٹی کی خدمت میں مصروف ہو جانا چاہیے(1982, 88)......

(جعفر منزل، علی گڑھ۔یکم نومبر 1931).....ہمارے خیال میں اس کام [علی گڑھ میں اردو کو استحکام عطا کرنا] میں چار مہینے لگیں گے اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار روپیہ صرف ہوگا۔اسی نومبر سے کام شروع کر دیا جائے اور مجھے پانچ سو روپیہ عنایت ہو کہ کل سے کام شروع کر دوں......مجھے آج ٹھیک چار بجے موٹر بھیج کر بلوائیے اور اس وقت صرف پانچ سو کا ایک چیک مجھے دے کر کلکتے جائیے (1982, 91-92)۔

.....(جعفر منزل، علی گڑھ۔ 12 نومبر 1931) ...... میں تعلیم کو سمجھتا ہوں اور مجھے نہ صرف کتابی علم ہے بلکہ یورپ اور مصر کی یونیورسٹیوں کو اچھی طرح دیکھ چکا اور تعلیم کی اصلیت اور اس کی غرض سے واقف ہوں۔ اس لیے آپ کی اور سر مالکم [ہیلی] کی رائے ہو تو میں رامپور کے صیغۂ تعلیمات کو ہاتھ میں لے کر بہت کام کر سکتا ہوں (1982, 93)۔

انھیں نہ تو علی گڑھ میں استاذی کا منصب عطا ہوا، نہ ہی ان کی اردو کے تئیں اسکیم کو عملی

جامہ پہنانے کے لیے رقوم کی منظوری ہوئی، نہ ہی رامپور کے صیغۂ تعلیمات سے وابستگی کے لیے کوئی پیش رفت ہوئی۔لیکن وہ بھی، شاد عظیم آبادی کی ہی مانند، اپنی علمیت، قابلیت اور تعلقات کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے مناصب ومراعات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ان کے خاندانی جاہ و حشم اور موجودہ خانگی حالات کے پس منظر میں ان کی ان کوششوں کو غیر اخلاقی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اسباب سے تعلقات میں کشیدگیاں پیدا ہوئیں۔جلیل قدوائی نے لکھا ہے کہ

> معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب [خیال] نے ازخود اپنے چندروزہ قیام علی گڑھ کے دوران میں مسعود صاحب سے غیر معمولی امیدیں وابستہ کر لی تھیں، اور شعبۂ اردو میں دخیل ہونا چاہتے تھے۔ ورنہ اس زمانے میں شعبۂ اردو کی توسیع کا مسئلہ یونیورسٹی کے منتظمہ کے زیرِ غور آیا ہی نہیں تھا (1990, 64)۔

اس کے بعد محولہ بالا مراسلوں کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسی ''صفات'' رکھنے والے بزرگ کے ہاتھوں میں، جن کے یہ خطوط مظہر ہیں، کسی یونیورسٹی کے نوجوانوں کا مستقبل دیا جا سکتا ہے۔خیال کے پاس کسی جامعہ سے حاصل کی ہوئی کوئی سند نہیں تھی۔محض انفرادی صلاحیتوں اور کسبی علم کی بنیاد پر راجواڑوں تک رسائی تو ممکن تھی لیکن تعلیمی اداروں تک نہیں۔ رہا معاملہ سرراس مسعود اور خیال کی اردو اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا اور رامپور کے صیغۂ تعلیم سے منسلک ہونے کا، تو جس طرح سید سرعلی امام اپنے تمام تر اختیارات کے باوجود شاد عظیم آبادی کے لیے کچھ نہیں کر سکے، بعینہٖ، سید سرراس مسعود بھی خیال سے اپنے خوشگوار تعلقات کے باوجود ممد ومعاون نہ ہو سکے۔اس پس منظر میں جلیل قدوائی کے ذریعہ خیال کے ''حسن ظن'' کو نشانہ بنانا محل نظر ہے۔ خیال ضرورتمند تھے اور انھوں نے سرراس مسعود سے توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ یہ ان کی سادہ لوحی تھی۔حیدرآباد اور خیر پور کے تلخ تجربات کے باوجود انھوں نے زمانے کی نبض اور اصحاب اقتدار سے منسلک حضرات کی عیاریوں کو نہیں پہچانا۔ان مراسلوں کے حوالے سے ہی مختار الدین احمد نے جلیل قدوائی کو 18 مارچ 1991ء کے ایک مراسلہ میں یہ لکھا تھا کہ

> انھیں [خیال کو] صدر شعبۂ اردو بنانے کا فیصلہ تو راس مسعود مرحوم نے کبھی

> نہیں کیا ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ان کے پیہم اصرار پر شعبۂ اردو یا کسی اور
> ادارے سے منسلک کرنا چاہتے ہوں لیکن اس کی مشکلات کا اندازہ کرکے
> انھوں نے یہ خیال ترک کردیا ہو۔ یہ بھی اسی وقت ممکن ہے جب حسن ظن
> سے کام لیا جائے۔ قاضی [عبدالودود] صاحب کی رائے تو شاد و خیال
> کے بارے میں بہت بری تھی (انجم،132)۔

عابد رضا بیدار (301) قاضی عبدالودود کی اس رائے کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ۔

> غالب، شاد اور ابوالکلام آزاد وہ تین موضوع ہیں جن پر بات چھڑ جائے تو
> پھر ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی!۔۔۔ باقی رہے شاد اور ابوالکلام تو ان
> دونوں نے اپنے بارے میں غلط بیانی اور مغالطہ سے اس قدر کام لیا ہے
> اور اپنی عظمت کا امیج ابھارنے کی ایسی بیجا کوششیں کی ہیں جس سے ایسی
> طبیعتوں میں جیسی قاضی صاحب کی ہے، ایک شدید ردعمل ہوا ہے۔ نتیجہ
> یہ ہے کہ یہ دونوں ان کے لیے الرجی کا سا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔

منصور عالم نے بھی قاضی عبدالودود کی تحریروں اور ان سے گفتگو کی بنیاد پر ان کے اور شاد کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے (1976,314-329)۔ یہ پسند و ناپسند کا معاملہ علمی کم، ذاتی زیادہ تھا۔ ان تمام بیانات کا ماحصل، مسلم عظیم آبادی کے لفظوں میں بس یہ ہے کہ یہ کمزوریاں طبعی یا وہ اخلاقی کمزوریاں تھیں جو غیر معمولی نہیں بلکہ تقاضائے بشریت تھیں اور اگلے وقتوں کے قانونِ تہذیب و اخلاق کے مطابق (269-268)۔ نصیر حسین خیال کے ساتھ بھی معاملہ یہی تھا کہ وہ مراعتوں کے حصول کو اپنا حق سمجھنے لگے تھے۔

1932ء سے 1934ء تک قومی زبان کے مسئلے سے متعلق اپنی تجاویز کے ساتھ خیال مختلف صوبوں کے سفر پہ رہے۔ اسی درمیان 1933ء میں ان کی کتاب ''مغل اور اردو'' شائع ہوگئی۔ وہ اس کوشش میں بھی تھے کہ یہ کتاب یونیورسٹیوں، کم از کم، پٹنہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہوجائے۔

سیر و سیاحت اور جہاں بینی کے شوق سے خیال کے ان مراسم کا علم بھی ہوتا ہے جو عظیم

آباد، کلکتہ اور دہلی ہی نہیں، دور دراز کے ممالک میں موجود اصحاب علم اور ارباب حکومت سے بھی تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے ایک وسیع حلقے میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی اور انھیں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

خودنوشت

ازمنۂ رفتہ کے اس کی زندگی، ان کے کارناموں اور ان کے عہد کے عظیم آباد اور کلکتہ کے علمی، ادبی، معاشرتی حالات سے واقفیت کے لیے ان کی تحریر ''تزک خیال'' بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی اشاعت ڈھاکہ سے خواجہ محمد عادل کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'جادو' کے جنوری۔فروری، مارچ، اپریل اور مئی 1926ء کے شماروں میں ہوئی تھی۔ اسے عام طور پہ خیال کی خودنوشت سوانح عمری کہا جاتا ہے۔ رسالہ جادو میں خیال کی پہلی تحریر مئی 1925ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جس کا عنوان 'نواب نصیر حسین خیال کا خط نواب صدر یار جنگ کے نام' ہے۔ اس خط کے ساتھ جو ادارتی تعارف شامل اشاعت ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں خیال کا شمار اردو کی معروف و مقبول شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 'تزک خیال' کی اشاعت اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی۔

خیال کے سلسلے میں جو بنیادی معلومات ادھر ادھر بکھری ملتی ہیں ان سب کی بنیاد خیال کی یہی تحریر ہے۔ شائق احمد عثمانی اور اقبال سلیم نے بالترتیب ''مغل اور اردو'' اور ''داستان اردو'' (خیال کی تصانیف) میں اسی کی روشنی میں خیال کا زندگی نامہ ترتیب دیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی پیش کردہ معلومات ہی بعد میں دیگر اصحاب کے ذریعہ دہرائی گئی ہیں، مثلاً محفوظ الحق احسن، قدوس صہبائی، شاہ ولی الرحمٰن کاکوی، سالک لکھنوی، پروفیسر اعجاز حسین یا عبدالخالق وغیرہم نے جو تفصیلیں پیش کی ہیں وہ تمام کی تمام ''مغل اور اردو'' میں عثمانی کے دیباچہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی کتاب میں بطور مقدمہ علامہ جمیل مظہری کی وہ تحریر بھی شامل ہے جسے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ان کی پہلی نثری یا تنقیدی تحریر کہا ہے۔

'جادو' کے جنوری۔فروری 1926ء کے شمارے میں 'تزک خیال' کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ اس شمارے کی ترتیب میں اسے پہلی تحریر کا مقام حاصل ہے اور یہ صفحہ 1 سے 24 تک پر

محیط ہے۔عنوان کا اندراج یوں ہے: ’تزک خیال۔یعنی عالیجناب نواب سید نصیر حسین خان خیال کی خودنوشت سوانح عمری‘۔ یہ خودنوشت مئی 1926ء کے شمارے تک قسطوار چھپی تھی۔مطبوعہ صفحات کی کل تعداد 71 ہے۔خیال نے اس میں ذیلی ابواب بھی قائم کیے ہیں۔اس میں خیال نے اپنے ذاتی معاملات کا تذکرہ شادی کے بعد کلکتہ میں مقیم ہونے تک کے مرحلے پر ختم کر دیا ہے۔ یہ تفصیل خودنوشت کی پہلی قسط میں ہی موجود ہے۔ دیگر قسطوں میں ان اصحاب فکر ونظر کا تذکرہ ہے جن سے کلکتہ میں قیام کے دوران خیال کی صحبتیں رہیں جبکہ آخری قسط میں کلکتہ میں مقیم ان ’حضرات مغلیہ‘ کا ذکر ہے جن کے روابط کلکتہ اور عظیم آباد دونوں ہی شہروں میں خیال اور ان کے خاندان سے تھے۔ بایں لحاظ، یہ تحریر انیسویں صدی کی اولین دو دہائیوں میں عظیم آباد اور کلکتہ میں ادبی نیز معاشرتی سطح پہ سرگرم وفعال تعلیمیافتہ طبقۂ اشرافیہ کی چند سر برآوردہ شخصیات کا تذکرہ بھی ہے۔خودنوشت کی پہلی قسط میں شامل ذیلی عناوین میں خاندان، تعلیم، تربیت، مذہب، معاشرت وتہذیب، زبان، ادب وشعر وشاعری، ادب اردو، اور شادی کے تحت انھوں نے اپنے خاندان کی تفصیل پیش کی ہے جس کے دوران حسب ونسب، علم دوستی، علم پروری، شعر وادب سے گہرے شغف، زبان اردو کے فروغ، صحت زبان، رئیسانہ شان وشوکت، دولت وثروت، معاشرتی جاہ وجلال اور سیاسی قدر ومنزلت کی باوقار انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔خاندان کی وجاہت ونجابت و سر بلندی کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے بیان کے دوران انھوں نے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم اس سے بہتر نہ ہوسکی جو ایک خوش حال مگر زوال پذیر خاندان کے لڑکوں کی ہوا کرتی ہے۔ان کی بسم اللہ ہوئی تو انھیں شیخ آغا خان کے حوالے کر دیا گیا جو خیال کے بزرگوں کے بھی استاد تھے۔انھوں نے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ اوائل عمری سے ہی وہ زبان کے معاملے میں مخصوص صلاحیتوں کے مالک تھے۔

> شیخ آغا خان مرحوم کی وفات کے بعد میر عبداللہ شاہ کشمیری (جو میرے بزرگوں اور شہر کے اکثر رؤسا کے استاد تھے) ہمارے اتالیق واستاد مقرر ہوئے۔ اخلاق کی اکثر کتابیں مثل اخلاق جلالی اور کیمیائے سعادت وغیرہ میں نے ان سے پڑھیں۔فقہ وعقائد کی بعض کتب بھی انھوں نے

پڑھائیں۔ اور جب فارسی میری قابل اطمینان دیکھی تو عربی شروع کرا دی... اس وقت میری عمر دس یا گیارہ سال کی ہو چکی تھی۔ میرے ہم سنوں میں اردو و فارسی میں میرا مدمقابل کوئی نہ تھا۔ ہم بے تکلف فارسی بولتے اور لکھ پڑھ سکتے تھے۔ عربی ادب پر چونکہ زیادہ زور دیا گیا تھا اس لیے اس زبان میں بھی اس وقت میری استعداد بری نہ تھی (7)۔

پٹنہ میں شمس العلما مولوی محمد حسین نے 1888ء میں محمڈن اسکول قائم کیا تھا۔ اس اسکول سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کولونیل عظیم آباد کے بدلتے ہوئے حالات کے دوران وہاں کے مسلمان شرفا اور رؤسا کے درمیان موجود انگریزی تعلیم سے وابستہ ایجاب و قبول کے مراحل کا ذکر یوں کیا ہے۔

شمس العلما مرحوم (مولوی محمد حسین) غیر مقلد تھے اور غدر میں ان کا مشہور خاندان برباد ہو چکا تھا۔ یہ خاندان اس وقت گورنمنٹ اور عام نظروں میں بھی بہت مشتبہ تھا۔ مرحوم نے یہ انگریزی اسکول قائم کر کے اپنے خاندان سے مخالفت بلکہ دشمنی مول لی اور اہل شہر سے الگ اختلاف شروع ہو گیا۔ مگر ان کے ارداہ و استقلال میں فرق نہ آیا۔... اسی زمانہ میں سرسید عظیم آباد آئے۔ شہر کے مختلف مقامات میں ان کا لکچر ہوا۔ وہاں کے رؤسا سے ملے۔ انگریزی تعلیم کی طرف سب کو متوجہ کیا۔ اور یوں یہ تعلیم وہاں ذرا آگے بڑھی (جنوری۔ فروری 8)۔

خیال نے چار برسوں تک اس اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا، مگر ''گھر میں مطالعہ جاری رہا'' (جنوری۔ فروری 9)۔

خیال نے اپنے گھر کے ماحول کے بیان کے دوران جن امور کو پیش کیا ہے ان سے بھی عظیم آباد کے تعلیمیافتہ گھرانوں اور ان کی معاشرت کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ان کے گھر کی شامیں علمی اشغال کے لیے وقف تھیں۔ کبھی تفسیر کبیر کے معانی و نکات سمجھائے جاتے، کبھی تفسیر حسینی کا درس ہوتا، کبھی نہج البلاغت کو سمجھنے سمجھانے کی مجلسیں آراستہ ہوتیں۔ ان کے علاوہ مثنوی معنوی،

تاریخ شاہنامہ اور دیوان آتش سے بھی اسرار و رموز کائنات و حیات اور فصاحت و بلاغت کی باریکیاں سمجھائی جاتیں۔ ان تمام صحبتوں میں حکیم مولوی عبدالباری، مولوی سید محمد عسکری شاہ صاحب، علامہ مولوی حکیم سید محمد جواد، شیخ علی باقر آباد اور شاد عظیم آبادی جیسی ہستیاں افہام و تفہیم میں فعال کردار ادا کرتیں۔ ان تربیتوں کے سبب ہی ان کے گھرانے کی زبان مستند اور قابل تقلید سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے کا عظیم آباد اہل زبان اور زباندانوں سے خالی نہ تھا۔ خیال نے ایک خاص بولی کے سیکھنے سکھانے کا ذکر بھی کیا ہے۔

> ... دو ایک ایسی زبانیں بھی سکھائی جاتی تھیں جو رمز میں شمار ہوتی تھیں۔ یعنی خواص کے سوا عوام بلکہ معمولی لوگ انھیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔ ان میں سے ایک زرزری بھی تھی۔ شاہان مغلیہ میں سے کسی بادشاہ نے اس زبان کو ایجاد کیا جو ضرورت کے وقت قلعۂ معلیٰ میں بولی جاتی تھی۔ خاص امراو وزرا کے سوا یہ زبان دوسرے بول نہ سکتے تھے، اور جن کے گھروں میں اس کا رواج تھا وہ اول نمبر کے امرا میں شمار ہوتے تھے۔ یہ زرزری ہمارے گھر میں دلی سے ساتھ آئی اور احتیاط کے ساتھ ہم لوگوں کو بھی سکھائی گئی (جنوری۔فروری 14)۔

'تربیت' کے عنوان سے بچوں کی گھریلو تربیتوں کی روایتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر مذہب، معاشرت و تہذیب، زبان، ادب و شعر و شاعری کا تذکرہ ہے۔ خیال لکھتے ہیں، 'ہماری یاد تک عظیم آباد اور خصوصاً ہمارے گھر میں پرانی تہذیب و معاشرت جاری تھی۔ صحبت کا قرینہ بھی وہی اگلا اور امیرانہ بلکہ شاعرانہ تھا(12)۔' اس تہذیب کے تحفظ کے لیے جتنی احتیاط برتی جاتی تھی اسے ملاحظہ فرمائیے۔

> درستگی و اصلاح زبان کا خیال بھی میرے خاندان میں بدرجۂ اتم تھا۔ دادی صاحبہ اور نانی صاحبہ کی زبان پر تو دلی کا خاص اثر تھا، اور وہ قائم رہا۔ ان کے وقت میں پیش خدمتوں اور اصیلوں کو نوکر رکھنے میں بڑی احتیاط کی جاتی تھی کہ بچوں کی زبان خراب نہ ہو۔ زنانہ میں عموماً راتوں کو بچے اکٹھا

کیے جاتے اور گھر کی بڑی بوڑھیاں وہاں آ بیٹھتیں۔ مکرنیاں، نسبتیں،
پہیلیاں اور دو سخنے وغیرہ کہے اور بجھائے جاتے، بلکہ یاد کرائے جاتے
اور پھر کہانیاں شروع ہوتیں۔ ان سے بھی زبان آتی اور محاورات کی تعلیم
ہوتی ہے۔ مردانے میں بھی یہ شغل رہا کرتا تھا۔ مسئلے مسائل کے ساتھ
مثلیں بھی یاد کرائی جاتیں اور ان کا محل استعمال بتایا جاتا اور لفظوں کے معنی
ومطلب کو ذہن نشیں کرایا جاتا تھا (جنوری۔فروری 14-13)۔

عظیم آباد کی شاعری کی محفلوں کے ذکر کے دوران انھوں نے لکھا ہے کہ وہ شاعری کی گود میں پیدا ہوئے اور اس کے دامن میں ہی پلے۔

ہمارے گھر میں، بلکہ ہمارے محلّہ میں، بلکہ سچ یوں ہے کہ عظیم آباد بھر میں
جسے ذرا شد بد تھی، وہ شاعر تھا۔ میونسپل اور کونسل کے الکشن کی جنگ کے عوض
مشاعروں کا دنگل ہوتا اور ہمارا گھر شاعروں کا اکھاڑا بنا رہتا تھا۔ ہمارے
ماموں خان بہادر شاد خود ملک الشعرا۔ پھر میرے چھوٹے ماموں سید میر
حسن خاں ایجاد بھی شاعر۔ میرے چچا، میر جعفر حسین، بھی شعر کہتے اور
میرے خالو، دونوں پھوپھا (نواب وزیر نواب اور نواب محمد حسن خان شمیم)
اور کل اعزا اگر کچھ کرتے تھے تو یہی شاعری (جنوری۔فروری15)۔

بقیہ حصوں میں خیال نے اپنے مذہبی اعتقادات، خاندان کے افراد کی امارت و ثروت اور ان کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی، مجالس کے انعقاد کا ذکر کیا ہے۔ 'شادی' کے عنوان سے ایک الگ باب قائم ہے جس میں انھوں نے اپنی شادی اور کلکتہ روانہ ہونے کی تفصیلیں پیش کی ہیں۔ اس کے آخری حصے میں چھ صفحات پہ شجرۂ نسب کے مختلف سلسلے درج ہیں۔

'تزک خیال' کی دوسری قسط (مارچ 1926ء، صفحہ 20-7) کا آغاز 'کلکتہ میں قیام' سے ہوتا ہے۔ اس قسط کے ساتھ ہی اپریل (صفحہ 32-9) اور مئی (صفحہ 19-1) کی قسطوں میں کلکتہ اور عظیم آباد کی ادبی، معاشرتی، سیاسی انجمنوں اور سرگرمیوں، سرگردہ شخصیتوں اور ان سے خیال کے تعلقات کا ذکر موجود ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مختلف ابواب قائم کرتے ہوئے خود

اپنی سرگرمیوں اور سیر وسیاحت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ان میں پیش کردہ تفصیلات کلکتہ اور دوسرے ادبی مراکز سے کسی نہ کسی طور وابستہ اس زمانے کی علم پرور اور اردو دوست ذی حیثیت شخصیات کا بھر پور تعارف بھی ہیں۔مثلاً کلکتہ میں اپنے قیام کو اپنی عملی زندگی کے لیے سنگ میل تصور کرتے ہوئے وہ محمڈن لٹریری سوسائٹی، محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن کے قیام کی تاریخ،ان کی خدمات اور ان کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار پیش کرتے ہیں تو وہیں نواب بہادر عبداللطیف خان،ان کے برادر خورد عبدالغفور نساخ، نواب بہادر سید امیر حسین،سید امیر علی، نواب سید محمد بہادر، مولوی عبدالغفور شہباز، خان بہادر مولوی دلاور حسین، مرزا جان طپش دہلوی، خان بہادر محمد یوسف، ابوالحسن خان بیرسٹر،نواب سراج الاسلام وغیرہ اور ان سے وابستہ بعض دیگر اصحاب سے اپنے تعلقات کی تفصیل بتانے کے ساتھ ساتھ ان کے اختصاص کا ذکر بھی کرتے ہیں۔نساخ کے سلسلے میں ان کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

> نواب مرحوم (نواب بہادر عبداللطیف خان) کے چھوٹے بھائی عبدالغفور خان نساخ بھی نہ صرف بنگالہ بلکہ ہندوستان بھر میں مشہور اور بحیثیت شاعر وادیب مانے جاتے تھے۔ان کی اردو مستند اور ان کی تحریر زمانہ کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر تھی۔ اس صوبہ میں انھوں نے اور ان کے خاندان نے ہندوستان کی اس راشٹر بھاشا (اردو) کی جو خدمت کی وہ اس زبان کی تاریخ میں یادگار رہے(مارچ 11)۔

خیال نے ان حضرات کا ذکر بھی اہتمام کے ساتھ کیا ہے جو مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے یا اپنی صفات کی وجہ سے مغل سمجھے جاتے تھے۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کا خیال کے گھرانے سے گہرا تعلق بھی تھا اور جو خود اپنے علمی مرتبوں کی وجہ سے بلند مقام کے حامل تھے۔اس سلسلے میں خیال کا درج ذیل بیان کلکتے میں ان کے تعلقات اور عظیم آباد میں خاندانی عظمت و رفعت کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ان حضرات کی زبوں حالی کی جانب واضح اشارے بھی:

> کلکتہ میں حضرات مغلیہ تقریباً سوا سو برس سے مقیم ہیں اور اب یہاں ان کی

ایک چھوٹی سی نو آبادی (کولونی) ہو گئی ہے۔شروع میں یہ حضرات بحیثیت
تاجر ادھر آئے اور جب تک یہ سلسلہ قائم رہا،ان کی یہ حیثیت درست رہی۔
اور اب ان پرانے خاندانوں کا نام ونشان بھی گم ہوا جاتا ہے۔
عظیم آباد میں غالباً صرف میرا ہی وہ گھر تھا جہاں یہ حضرات بے تکلف چلے
آتے اور بے غل وغش رہتے۔دادا صاحب (میر محمد محسن) کے وقت میں تو
جب کوئی نو وارد ایرانی بمبئ سے کلکتہ آنے لگتا، یا کلکتہ کا کوئی مغل پچھّاں
جانے لگتا تو اس پر عظیم آباد میں اترنا اور میرے گھر میں دو چار ہی دن کے
لیے سہی، رہنا واجب تھا۔یہ ایرانی میرے دادا کو محسن آغا کہا کرتے اور ان
سے بے انتہا مربوط تھے۔یہ سلسلہ اور ربط میری یاد تک قائم تھا۔آج بھی
اگر کوئی پرانا مغل مل جائے اور اس کے سامنے عظیم آباد کا نام لو تو وہ اتنے
بڑے شہر کو صرف میرے گھر کے اندر محدود بتائے گا (مئی 2-1)۔

ان اصحاب میں آغا سید حسین شوشتری، حاجی آقا سید صادق، آقا سید محمد علی، آقا میر احمد، حاجی میرزا امامی، آقا شیخ محمد جیلانی مجتہد، آقا سید طٰہٰ کاظمینی، آقا سید جلال الدین وغیرہ وہ اہم شخصیتیں ہیں جو کسی نہ کسی طور خیال کی شخصیت پہ اثر انداز ہوئی ہیں۔حاجی میرزا امامی کے متعلق خیال کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

نام بھی ایرانی اور وضع و معاشرت بھی ایرانی۔ فارسی اہل زبان کی طرح
بولتے اور ہندیوں سے زیادہ ایرانیوں سے مانوس تھے۔اس لیے ہندی نہیں
بلکہ مغل سمجھے گئے۔مگر تھے دراصل عظیم آبادی... اہل علم میں سے تھے اور رمل
میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ان کا حکم مانا جاتا اور اکثر درست ہوتا تھا۔
اس فن کے معتقد ان کے گرویدہ تھے اور بغیر ان کے حکم کے کوئی کام نہیں
کرتے تھے۔ ہر قوم اور ملت سے ربط تھا۔ یہودی بھی کثرت سے آتے اور
ان کے مرید تھے۔ایک یہودی کی چار بیٹیاں تھیں۔ان میں سے ایک کے
ساتھ انھوں نے عقد کیا۔ دوسری پرنس فرخ شاہ (ٹالی گنج) کی بیگم صاحبہ

بنیں۔ تیسری آغا میرزا بابر کی خانم تھیں۔ یہ وہی میرزا بابا ہیں جن کی مرغی ہٹے (کلکتہ) والی مسجد ایرانیوں کی مسجد کہلاتی ہے (مئی 10-9)۔

ان حصوں میں ہی خیال نے یہ بھی لکھا ہے کہ ماموں شاد عظیم آبادی کی دوسری بیگم جو کلکتہ کے آقا میر نواب کی صاحبزادی تھیں، فارسی پہ ماہرانہ دسترس رکھتی تھیں۔ فارسی میں گفتگو کرنے کے شوق میں خیال ہر وقت ان کے آس پاس ہی رہا کرتے تھے۔ اور اسی صحبت نے انھیں فارسی میں لکھنے کے لیے بھی آمادہ کیا۔ ان کا بیان ہے کہ وہ جب فارسی اخبار ''جبل المتین'' سے متعارف ہوئے تب ان کا سن پندرہ سال سے زیادہ نہ تھا۔ اس کے مدیر آقا سید جلال الدین کے تئیں انھوں نے بے پناہ عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے (مئی 15)۔ فرماتے ہیں:

> قاچاریوں کا ظلم جب ایران میں حد سے سوا ہوا اور جمال الدین افغانی کی گرفتاری کی خبر گرم ہوئی تو انھوں نے ایران کو وداع کہا۔ آقا سید جلال الدین بھی اسی زمانے میں شورش میں اپنے ملک سے عراق چلے گئے۔ مگر وہاں بھی جائے امان نہ دیکھ کر ہندوستان کا رخ کرنا پڑا اور آخر بمبئی پہنچے۔ وہاں چند دن قیام کر کے حیدرآباد چلے آئے۔ دل کے حوصلے دکن میں کیا نکلتے۔ آخر علی گڑھ آئے کہ وہاں کم از کم علمی مذاق اس وقت تک تھا۔ سر سید حیات تھے۔ ان سے مل کر خوش ہوئے اور کالج میں فارسی کا پروفیسر مقرر کرنا چاہا۔ مگر ان دونوں صاحبوں کے خیالات میں سخت اختلاف تھا۔ سر سید انگریز دوست (پرو انگلش) اور یہ اپنے استاد سید جمال الدین افغانی کے مقلد۔ اور اس لیے فرنگی دشمن۔ نباہ مشکل تھا۔ اس کا احساس کر کے علی گڑھ سے رخصت ہوئے۔ عظیم آباد آئے، اور وہاں سے کلکتہ۔ تیس یا پینتیس برس ادھر کا کلکتہ اور تھا۔ ایرانی سلامت تھے۔ اور ہندی مسلمان بھی اتنا گرے ہوئے نہ تھے۔ فارسی کا مذاق علم اور اس بادۂ شیراز کا دور علی الدوام تھا۔ ضرورت اور مذاق کو سمجھ کر انھوں نے اخبار ''جبل المتین'' یہاں سے شائع کیا۔

1898ء میں جب کلکتہ کے فارسی اخبار 'جبل المتین' کے مدیر سید جلال الدین عظیم آباد تشریف لائے تو خیال کے مہمان ہوئے۔ عظیم آباد نیز بہار میں اخبار ہذا کی توسیع اشاعت آپ کے ذمے کی گئی۔ 'جبل المتین' میں خود خیال کے فارسی مضامین بھی شائع ہوئے جن سے شہادت ملتی ہے (عثمانی 4) کہ وہ زبان وادب کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تاریخ اور مذہب کی بھی بیش بہا معلومات رکھتے تھے۔

''تزک خیال'' خیال کا زندگی نامہ ہونے کے پہلو بہ پہلو عظیم آباد اور کلکتہ کی بیسویں صدی کے ابتدائی دودہوں کی لسانی، ادبی، دانشورانہ اور کسی حد تک سیاسی سرگرمیوں کا آئینہ خانہ بھی ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب نگارش شگفتہ اور صاف وسادہ تو ہے ہی، خیال کی رواں دواں شگفتہ اور بامحاورہ نثر کی بہترین مثال بھی ہے۔ وکیل محمد یوسف کے احوال پیش کرنے کے دوران ان کی عبارت آرائی کی سادگی کا حسن ملاحظہ فرمائیں۔

> وکیل محمد یوسف (خان بہادر) بہار کے رہنے والے اور ایک موقر برہمن کے فرزند تھے۔ وکیل ہوکر کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ وہ زمانہ کچھ اور تھا، بہار کے کل مقدمات ان کے پاس آتے تھے۔ وہ ایک مرنج ومرنجان بزرگوار اور کلکتہ میں بیحد ہر دلعزیز تھے۔ ہمارے خاندان سے ان کے تعلقات عزیزانہ تھے۔ وہ حضرت یعقوب کی طرح جہاں اپنے بچوں پر فدا تھے، وہاں مجھے بھی عزیز ہی نہیں رکھتے بلکہ اپنا یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ ورزش کا ان کو بیحد شوق تھا۔ اپنے محل کے ایک وسیع ہال کو اکھاڑا اور اور دوسرے کو تلاؤ بنا رکھا تھا۔ وہاں ورزش ہوتی اور یہاں پیرا کی۔ سنگ لہسنیا کے پہننے کا انھیں بیحد شوق تھا۔ چاندی اور سونے کی پتیلیوں میں ان کا کھانا پکتا اور وہ پہلوان اس میں سے ایک وقت میں سیر بھر نوش کرنے میں تکلف نہ کرتا (مارچ 19-18)۔

یہ خیال کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے اور نہ ہی 1925ء تک کے مکمل حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ شادی کے ذکر کے بعد اس میں ذاتی کوائف پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ یہ حصہ بھی بہت

ہی مختصر ہے۔ اسے شادی اور پھر اہلیہ کے انتقال کے ذکر پہ ختم کر دیا گیا ہے۔

> سنہ 1897ء میں، یعنی جبکہ میری عمر 19 برس کی تھی، کلکتہ (مٹیا برج) کے ایک مشہور خوشحال خاندان میں میری شادی ہو گئی۔ میری بی بی کنیز ام سلمی نواب انتظام الدولہ مرزا احمد بیگ کی بیٹی تھیں۔ انھوں نے سنہ 1922ء میں قضا کی۔ ہمارا ان کا ساتھ 25 برس رہا۔ ہمارے ان کے تعلقات معمولی زن و شو سے بہت زیادہ، یعنی، عاشقانہ و معشوقانہ تھے۔ انھوں نے اپنی خوشی کو میری خوشی و مرضی پر ہمیشہ قربان کیا۔ ہمارے ان کے [درمیان] کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ ہم نے ان کی سی نیک اور شریف بی بی نہیں دیکھی۔ اللھم اغفرھا (جنوری۔ فروری 18-17)!

یہ درست ہے کہ خیال نے اس میں اپنی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس کی ہئیت بھی خود نوشت سوانح عمری جیسی نہیں ہے۔ کئی اہم ذاتی تفصیلات اس میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن جو تفصیلات موجود ہیں وہ خیال کی شخصیت کی بالیدگی و تعمیر میں یقیناً مد و معاون ہوئی ہیں۔ اسے دراصل، یادداشت (memoir) کی صورت میں لکھا گیا ہے اور مصنف نے اپنے طور پہ چند اہم کوائف کو ہی قلمبند کیا ہے۔ غالباً اسی لیے خود خیال نے بھی اسے تزک ہی کہا ہے۔

کلیم سہسرامی کی ایک تحریر سے (1991) علم ہوتا ہے کہ ''تزک خیال'' کا مخطوطہ ڈھاکا یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''روایت و درایت'' میں 'ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال کی آپ بیتی' کے عنوان سے شائع ایک تحریر میں لکھا ہے کہ

> پچھلے چند برسوں سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں کچھ ایسے قلمی نسخے، بیاض اور منتشر کاغذات دستیاب ہوئے ہیں جو غالباً رسالہ 'جادو'، ڈھاکہ (مجریہ 1924ء) کے ایڈیٹر شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کو اشاعت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ انھیں کی مدد سے ذیل کے دو مضامین مرتب کیے گئے ہیں جو حکیم صاحب کے صاحبزادے نے ڈھاکا یونیورسٹی کو عطیہ کے طور پہ دے دیے ہیں (142)۔

انھوں نے جن دو مضامین کا ذکر کیا ہے وہ محولہ بالا مضمون اور 'نصیر حسین خیال کی ایک نادر تحریر' کے عنوان سے شامل کتاب ہیں۔ یہ دونوں ہی تحریریں 'جادو' میں 1926ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ وہ منتشر کاغذات جن کی مدد سے متذکرہ دو مضامین ترتیب دیے گئے، دراصل ''تزک خیال'' کا ہی حصہ تھے۔ انھوں نے جو حصے شائع کیے ہیں ان میں اور مطبوعہ ''تزک خیال'' کے متعلقہ حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نصیر حسین خیال کی نثر نگاری کے سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ قائم کرنے میں اس تحریر سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ ''تزک خیال'' کو دلچسپ پیرائے میں، زبان و بیان کی خداداد خوبصورتیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فطری انداز، رواں، برجستہ، بامحاورہ، شگفتہ عبارتوں میں لکھی ہوئی نثر کی کامیاب مثال کے طور پہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

انتقال

خیال اکتوبر 1934ء میں پٹنہ کے سفر پہ گئے۔ وہاں سے اسی برس انھوں نے پھر علی گڑھ کا رخ کیا اور 9 دسمبر کو چھتاری کے نواب سر احمد سعید خاں، وزیر اعظم، صوبۂ متحدہ کے مہمان ہوئے۔ وہیں حرکت قلب بند ہو جانے سے 11 دسمبر کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ نواب صاحب نے جسد خاکی پٹنہ بھیجنے کا نظم کیا۔ خاندانی قبرستان میں 13 دسمبر کو شاد کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے انتقال پہ اظہار تعزیت کرتے ہوئے 'ندیم' (جنوری 1935) نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا کہ

> آہ! اپنے صوبے کی ناقدردانیوں کا زخم خوردہ خیال اپنے وطن میں لایا بھی گیا کب؟ جبکہ اس روٹھے ہوئے ادیب کو منانے کے کوئی تدبیر موثر نہ ہو سکی۔۔۔نواب نصیر حسین خیال کی اچانک رحلت نے اردو ادب کو ایک ایسے جادو نگار اہل قلم کی سرپرستی سے محروم کر دیا جس کی زندگی کا واحد مقصد اردو کی ترقی اور ادب کی خدمت تھا۔

'سہیل' (سالنامہ 1936ء) کے حصہ 'یادرفتگاں' میں پروفیسر آل احمد سرور کا لکھا ہوا تعزیتی پیغام شامل اشاعت ہے جس میں بالترتیب حضرت ریاض خیر آبادی، حضرت عزیز لکھنوی، حضرت نظم طباطبائی، جناب جگت موہن لال صاحب رواں، نواب نصیر حسین خیال، جناب آغا

حشر کاشمیری اور مولوی ممتاز حسین کی رحلت کی خبریں موجود ہیں۔ خیال کے سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

> نواب نصیر حسین خیال کو بجا طور پر 'بہار کا آزاد' کہا جاتا تھا۔ آپ کے طرز تحریر میں وہی دلکشی و دلآویزی پائی جاتی تھی جو مرحوم آزاد کا طرۂ امتیاز تھی۔ آپ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے صوبۂ بہار میں اردو کی ترتیب و تہذیب میں نمایاں حصہ لیا۔ ''مغل اور اردو'' جو دراصل آپ کی مجوزہ تصنیف ''داستان اردو'' کا ایک باب تھی، ملک میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کی بے وقت موت سے یہ داستان ادھوری رہ گئی (ص۔ با)۔

اعجاز حسین ان کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں (412) ہیں:

> آپ [خیال] کے خطبۂ صدارت (اردو کانفرنس، منعقدہ 1916ء اور اردو کی تاریخ ''داستان اردو'' نے مستقل کتاب کی صورت میں آپ کی شہرت کو غیر فانی بنا دیا۔ 12 دسمبر 1934ء [صحیح 11 دسمبر ہے] کا دن بھی خدا جانے کیسا تھا کہ جس نے دفعتاً خیال کو ہمیشہ کے لیے اردو کی خدمت سے محروم کر دیا۔

شخصیت

نصیر حسین خیال وجیہ و شکیل تھے۔ رنگ گندمی اور قد میانہ تھا۔ مونچھیں گھنی اور بڑی تھیں جن کے نکیلے کونے اوپر اٹھائے رکھتے تھے۔ شخصیت بارعب تھی اور ان کی وضعداری کی وجہ سے پرکشش بھی۔ شگفتہ مزاج تھے اور پہلی ملاقات میں ہی کسی کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ کسی بھی موضوع پر بے تکلف اور بیباک گفتگو کرتے تھے۔ اس دوران حس مزاح اور حاضر جوابی بھی بلا کی ہوتی تھی۔ نقی احمد ارشاد کا بیان ہے کہ خیال اور ان کے بڑے بھائی عابد حسین کمال نہایت حسین و جمیل اور باغ و بہار تھے (18)۔ گفتگو کے دوران صحت زبان کا خاص خیال رکھتے اور مخاطب سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو فوراً ہی اس کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ مذہبی اثرات نہیں تھے لیکن مرثیہ

خوانی کی محفلوں میں شوق سے شریک ہوا کرتے تھے۔ شیروانی یا انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے۔ دونوں ہی صورتوں میں ایک خاص قسم کی ٹوپی سر پہ ہوتی تھی جس کے سامنے کے حصہ میں دو بوتام لگے رہتے تھے۔ غالباً یہ ٹوپی سفر یورپ کی یادگار تھی۔ اس قسم کی ٹوپیاں وہاں فیلڈ سروس کیپس کہلاتی ہیں۔ دیدہ زیب اور قیمتی لباس کے شوقین تھے اور بود و باشِ طرز مغربی کے دلدادہ۔

حوالے:

1۔ ارشد، اعجاز علی۔ (اگست 1982)۔ جمیل مظہری کی تنقید نگاری۔ آجکل: نئی دہلی۔ ص 87-84۔

2۔ ارشاد، نقی احمد۔ (1982)۔ شاد کا عہد اور فن۔ پٹنہ: شاد عظیم آبادی میموریل کمیٹی۔

3۔ (1986)۔ نصیر حسین خیال کے مکتوبات و مقالات۔ پٹنہ: بہار اردو اکادمی۔

4۔ احمد، سید بدر الدین۔ (2003)۔ حقیقت بھی کہانی بھی۔ پٹنہ: بہار اردو اکادمی۔

5۔ اشرفی، وہاب۔ (1975)۔ شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری۔ گیا: کلچرل اکیڈمی۔

6۔ انجم، شاہ۔ (2008)۔ 'مختار الدین احمد کے خطوط بنام جلیل قدوائی'۔ تحقیق، جام شورہ، شمارہ 16۔ ص 125-163۔

7۔ بیدار، عابد رضا۔ (1969)۔ اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار۔ رامپور: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز۔

8۔ (1976)۔ 'کچھ قاضی صاحب کے بارے میں'۔ معاصر (قاضی عبدالودود نمبر)۔ پٹنہ۔ ص 293-313۔

9۔ قاضی عبدالودود کا 1936 کا 'معیار'۔ (1981)۔ پٹنہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری۔

10۔ حسین، سید اعجاز۔ (1940)۔ مختصر تاریخ ادب اردو۔ الہ آباد: انڈین پریس لمیٹڈ۔

11۔ خیال، نواب نصیر حسین۔ (مئی 1925)۔ 'نواب نصیر حسین خیال کا خط نواب صدر یار جنگ کے نام'۔ جادو: ڈھاکہ۔ ص 22-1۔

12۔ (جنوری۔ فروری 1926)۔ 'تزک خیال'۔ جادو: ڈھاکہ۔ ص 25-1۔

13۔ (مارچ 1926)۔ 'تزک خیال'۔ جادو: ڈھاکہ۔ ص 20-7۔

14۔ (اپریل 1926)۔ 'تزک خیال'۔ جادو: ڈھاکہ۔ ص 22-9۔

15۔ (مئی 1926)۔ 'تزک خیال'۔ جادو: ڈھاکہ۔ ص 19-1۔

16۔خیال،ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں۔(1933)۔مغل اور اردو۔کلکتہ: شائق احمد عثمانی اینڈ سنز پبلشرس۔
17۔(1945)۔ داستان اردو۔حیدرآباد: ادارۂ اشاعت اردو۔
18۔سکسینہ، رمن راج۔(1991)۔آسماں جاہ کا حیدرآباد۔حسامی بک ڈپو: حیدرآباد۔
19۔سہسرامی، کلیم۔(1991)۔(مرتب اشفاق عادل)۔روایت ودرایت، نقاد پبلشرز، پٹنہ۔
20۔صدیقی، ابواللیث۔(جنوری 1936)۔'اردو اور اس کے تاریخی ماخذ۔سہیل (سالنامہ): علی گڑھ)۔(ادارت)۔پروفیسر رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور۔ص 115-85۔
21۔ضیا، حبیب۔(1978)۔مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد: حیات اور ادبی خدمات۔حیدرآباد: دائرہ پریس۔
22۔عالم، محمد منصور۔(1976)۔'شاد عظیم آبادی اور قاضی عبدالودود'۔معیار (قاضی عبدالودود نمبر)۔ پٹنہ۔ص 329-314۔
23۔(1980)۔بہار میں تذکرہ نگاری۔پٹنہ: کتاب منزل۔
24۔عثمانی، ابوذر۔(1955)۔ 'بہار میں اردو تنقید کا ارتقا'۔صنم (بہار نمبر): پٹنہ۔
25۔قدوائی، جلیل۔(1982)۔شعلۂ مستعجل (یعنی نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود مرحوم)۔ کراچی: راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان۔
26۔(1990)۔تجزیے اور تجربے۔کراچی: راس مسعود ایجوکیشن اینڈ کلچر سوسائٹی آف پاکستان۔
27۔'مکاتیب خیال'۔(نومبر 1957)۔نقوش (مکاتیب نمبر، جلد اول)، شمارہ 66 ,65۔ص 476-478
28۔'مکاتیب کشن پرشاد'۔(نومبر 1957)۔نقوش (مکاتیب نمبر، جلد اول)، شمارہ 66 ,65۔ص 371-372۔
29۔'مکتوبات خیال'۔(1935)۔ندیم (بہار نمبر): گیا۔ص 22-21۔
30۔'مکتوبات خیال'۔(جنوری 1935)۔ندیم : گیا۔ ص 5۔
31۔ہاشمی، ارشد مسعود۔(اپریل-جون 2004)۔'نصیر حسین خیال'۔فکر و تحقیق، ص 168-149۔
32۔(اپریل-جون 2019)۔'نصیر حسین خیال کی نثر نگاری'۔فکر و تحقیق، ص 83-64۔

پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ میں صدر شعبہ اُردو ہیں۔

ہمارے قلمکار

(ادب وثقافت کا اشاریہ۔شمارہ نمبر ایک تا9)

نمبر شمار	نام	عنوان	شمارہ نمبر
.1	پروفیسر شارب ردولوی	اقبال کے شعری ابعاد اور تعین قدر کا مسئلہ	01
		ایک درویش انقلابی: نیاز حیدر	02
		احمد ندیم قاسمی: ایک اہم افسانہ نگار	06
.2	پروفیسر عبدالستار دلوی	سر تیج بہادر سپرو، اُردو اور قومی زبان کا مسئلہ	01
		مولانا آزاد کی فکر کے چند تکثیری زاویے	03
		لفظ ''میاں'' کی لسانی حیثیت اور تہذیبی معنویت	04
		دکنی شاعری میں عشق رسولؐ	06
		وجے تینڈولکر اور 'خاموش! عدالت جاری ہے'	09
.3	پروفیسر عتیق اللہ	ہندوستانی تہذیبی روایت اور اُردو شاعری	01
		عابد سہیل: جو یاد رہا	02
.4	پروفیسر م۔ن۔سعید	ہاشمی بیجاپوری کی تہذیبی اہمیت	01
.5	پروفیسر فیروز احمد	مشترکہ تہذیب، اُردو اور جگن ناتھ آزاد	01
		فرہنگ تحفۃ السعادات کا ایک نادر نسخہ اور اس میں شامل ہندوی مرادفات	07
		پنجابی آمیز اردو کے چند قدیم رسائل	08
.6	پروفیسر رحمت یوسف زئی	ثقافتی اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو زبان کا حصہ	01
.7	پروفیسر عقیل ہاشمی	انشائیہ نگاری میں تشبیہ کا عمل	01

56.	ڈاکٹر مصطفیٰ علی خاں فاطمی	مہاراجہ شاد اور علامہ اقبال کے خطوط	05
57.	ڈاکٹر خالد اشرف	اختر الایمان کی شاعری کی قدر شناسی	05
58.	پروفیسر اسلم جمشید پوری	ہندوستانی تہذیب اور اُردو شاعری بیگ احساس کے افسانوی ابعاد حب الوطنی اور اردو افسانہ (آزادی کے بعد)	05 07 09
59.	ڈاکٹر محمد کاظم	ڈراما انارکلی: ایک مطالعہ	05
59.	ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی	اقبال سہیل کا تصورِ غم	05
61.	ڈاکٹر وسیم بیگم	علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی مختلف جہات	05
62.	ڈاکٹر غلام حسین	عمیق حنفی کا عہد اور ادبی تناظر: ایک جائزہ	05
63.	ڈاکٹر محمد جنید ذاکر	دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سو سال مختلف اداروں میں اردو ترجموں کی صورتحال	05 09
64.	ڈاکٹر الطاف انجم	کشمیری زبان کی تنقید پر اُردو تنقید کے اثرات	05
65.	ڈاکٹر محمد مستمر	اُردو غزل میں ہندوستانی عناصر (1980ء کے بعد) اُردو شاعری میں گورو نانک دیو کا تصور	05 07
66.	پروفیسر خالد محمود	محمد شاہی عہد کے ترجمان شاہ مبارک آبرو اور ان کا رنگِ سخن	06
67.	پروفیسر وہاب قیصر	ادب و ثقافت کی گمشدہ و تلف شدہ تحریریں	06
68.	پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی	ڈاوَڈے جِنگ (فضائل عدم عمل)	06
69.	ڈاکٹر مسرت جہاں	عصری حسیت اور اردو افسانہ ترنم ریاض کی نظموں میں سماجی و تہذیبی شعور	06 09
70.	ڈاکٹر عباس رضا نیر	اردو نثر کے ارتقا میں اودھ کی داستانوں کا حصہ	06
71.	ڈاکٹر سعیدہ پٹیل	ڈاکٹر مومن محی الدین: فارسی کے ہمہ جہت استاد سورت کی کہانی۔ شاعروں کی زبانی	06 08
72.	ڈاکٹر عطیہ رئیس	اکبر الہٰ آبادی کی ظرافت نگاری	06

ISSN : 2455-0248

Adab-o-Saqafat

(Bi-Annual Research & Refereed Journal)

Issue No.: 10 March, 2020

***Editor:* Mohd. Zafaruddin**

25فروری2020: اردو مرکز برائے فروغ علوم کے زیر اہتمام ''قومی اُردو سائنس کانگریس 2020'' میں
ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کی کتاب 'عملی کام برائے حشریات' کے اجرا کا منظر۔

4مارچ2020: شعبہ فارسی کی بین الاقوامی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انچارج وائس چانسلر پروفیسر ایوب خان۔

Directorate of Translation & Publications

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032, Telangana (India)

E-mail: directordtp@manuu.edu.in

website: www.manuu.edu.in, Mobile: 09347690095